بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

پاکستان کی عدالتِ عظمیٰ کے سربراہ جسٹس کارنیلیس صاحب نے یوں تو گزشتہ سالوں میں اسلام کے نظامِ عدل اور پاکستان اور مسلمانوں کے مستقبل کے بارے میں بعض بڑی فکر انگیز باتیں کہی ہیں مگر عدلیہ کے سب سے بڑے عہدے سے سبکدوش ہوتے وقت انہوں نے متعدد الوداعی تقاریب میں جن بیش قیمت خیالات کا اظہار فرمایا ہے اُن پر ہم میں سے ہر فرد کو بڑے ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہیے۔ جب ہم اُن کے اِن ارشادات کا تجزیہ کرتے ہیں تو ہم انہیں مندرجہ ذیل چار بنیادی نکات کی تشریح و توضیح پاتے ہیں:

پہلی بات جس پر انہوں نے زور دیا وہ یہ ہے کہ کسی فرض کی دیانتداری سے انجام دہی کے لیے یہ ضروری ہے کہ انسان کے دل میں ہمیشہ یہ احساس موجود رہے کہ کوئی ہمہ بین آنکھ، اور کوئی علیم و خبیر ہستی اور کوئی سمیع و بصیر ذات نہ صرف اُس کے ظاہری افعال و اعمال کو دیکھ رہی ہے بلکہ اُس کے دل کی گہرائیوں میں اُبھرنے والے خیالات تک کو پوری طرح جانتی ہے۔ یہی ایک احساس انسان کو مشکلات اور موانع کے ہجوم اور تخویف و ترغیب کے روح فرسا ماحول میں حق و صداقت کے راستے پر گامزن رکھتا ہے اور انسان کے اندر یہ صلاحیت پیدا کرتا ہے کہ وہ حق کے لیے ہر قسم کے خوف اور لالچ کو پائے استحقار سے ٹھکرا دے اور ہر قسم کے دباؤ کا ہمت اور جرأت سے مقابلہ کرے۔ حق کی محافظت و پاسبانی کرے اور اس راہ میں کسی چیز کو حائل نہ ہونے دے۔ حق و صداقت کی راہ کوئی پھولوں کی سیج نہیں کہ اس پر انسان مزے سے آرام کرے۔ یہ راہ بڑی دشوار اور یہ منزل بڑی کٹھن ہے اور اس پر وہی شخص استقلال کے ساتھ گامزن رہ سکتا ہے جسے اللہ پر پختہ یقین ہو، جس کا دل قادرِ مطلق کی محبت میں سرشار ہو، اور جسے باری تعالیٰ کی ناراضی کا بندوں کی ناراضی کے مقابلے میں کہیں زیادہ احساس ہو، اور اس سے بڑھ کر اُس کے ذہن میں یہ خیال پوری طرح راسخ ہو کہ اُسے ایک دن مالک الملک کے حضور میں اپنے نامۂ اعمال

کے ساتھ پیش ہونا ہے۔ کسی معاشرے میں جتنا کوئی شخص اہم اور باحیثیت ہوتا ہے اور اس پر جتنی نازک ذمہ داری عائد ہوتی ہے اُسی نسبت سے اُس پر مختلف سمتوں سے اور مختلف طریقوں سے دباؤ بھی زیادہ پڑتا ہے اور اسی تناسب سے اُسے دنیاوی مفادات کے مواقع بھی زیادہ میسّر آتے ہیں۔ اسی بنا پر اُس کے دل میں احساسِ ذمہ داری اور حق و صداقت کے لیے محبت بھی سب سے زیادہ ہونی چاہیے۔ کیونکہ اگر اس نے دباؤ میں آکر یا طمع و حرص کے دام میں گرفتار ہو کر عدل و انصاف کا دامن چھوڑ دیا تو اس سے پورے معاشرے کے اندر زبردست بگاڑ اور اختلال پیدا ہو گا۔

خواب و خیال کی دنیا میں رہنے والے یا پاکستان کی ترقی کے افسانے گھڑنے والے جو چاہیں کہتے رہیں اور برسرِ اقتدار طبقوں کی جس طرح چاہیں مدح و توصیف کر کے انہیں خوش کرتے رہیں، یا خود اس ملک کے حکمران طبقے جس طرح چاہیں اپنی فیض رسانیوں کے گن گاتے رہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ پاکستان کا عام شہری اس وقت بے حد دکھی ہے۔ سرکاری اعداد و شمار کے طلسمات سے اس کا پیٹ نہیں بھرتا۔ ریڈیو اور ٹیلیویژن پر خوش کن پروگرام نشر ہونے سے اس کی جان و مال و عزت و آبرو کی حفاظت کا کوئی سامان بہم نہیں پہنچتا۔ اخبارات میں حکومت کے کارناموں کے مبالغہ آمیز تذکروں سے اُسے سکونِ خاطر نصیب نہیں ہوتا۔ اور کانفرنسوں اور رقص و سرود کی محفلوں سے اس کی بے بسی اور بے کسی میں کوئی فرق نہیں آتا۔ فلسفے میں کسی دعوے یا کسی کام کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانے کے لیے ایک معیار نتائجی جائزہ (PRAGMATIC TEST) بھی ہے۔ اس معیار کی رُو سے انسان کسی دعوے یا حقیقت کا عملی اعتبار سے جائزہ لیتا ہے اور دیکھتا ہے کہ اُس سے عالمِ واقعات میں کیا اثرات رونما ہوتے ہیں۔ جب ہم اس نقطۂ نظر سے پاکستانی عوام کے حالات کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہم سخت مضطرب اور پریشان ہوتے ہیں۔ ہمیں یہ بتایا جاتا ہے کہ ملک میں سرمایہ کاری بڑھ رہی ہے مگر اس سے فطری طور پر جو نتیجہ برآمد ہونا چاہیے، یعنی روزگار میں اضافہ ہو اور عام آبادی کو ضروریاتِ زندگی فراہم ہوں، وہ ہمیں کہیں نظر نہیں آتا، بلکہ ہم دن بدن بیروزگاری اور خستہ حالی کو بڑھتا ہوا دیکھتے ہیں۔ ہمیں یہ کہا جاتا ہے کہ عوام کے نقطۂ نظر سے یہ ایک فلاحی مملکت ہے لیکن عملی زندگی میں ہمیں صورتِ حال اس کے برعکس نظر آتی ہے۔ غریب انسان پر عرصہ

حیات ناقابلِ بیان حد تک تنگ ہوتا جا رہا ہے اور ایک محدود طبقہ اس کے گاڑھے پسینے کی کمائی سے دادِ عیش دے رہا ہے۔ اپنی نہایت قلیل آمدنی سے وہ اپنا پیٹ نہیں بھر سکتا۔ تن ڈھانکنے کے لیے کپڑا اُسے میسر نہیں آتا۔ بچوں کی تعلیم کا انتظام کرنے سے وہ قاصر ہے اور اگر بیمار پڑ جائے تو علاج و معالجہ کے اخراجات وہ برداشت نہیں کر سکتا۔

یہ سب حالات اگرچہ اپنی جگہ بڑے پریشان کُن اور اذیت ناک ہیں مگر ان سب سے زیادہ دردناک یہ بات ہے کہ جن لوگوں کے ہاتھ میں اُس کے دُکھوں کا مداوا ہے انہوں نے دنیوی مفادات کی محبت میں حق اور انصاف کا دامن چھوڑ دیا ہے۔ وہ جب بھوک کی شدت کا گلہ کرتا ہے تو ذمہ دار حضرات دلآویز تقریروں سے اُسے بہلانے کی کوشش کرتے ہیں اور اسے سربفلک عمارات، عظیم الشان ہوٹل اور وسیع کارخانے دکھا کر یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ تمہیں خواہ مخواہ بھوک کی شکایت ہو رہی ہے، تم تو معاشی لحاظ سے ہر آن خوشحال اور فارغ البال ہو رہے ہو۔ وہ جب برسر اقتدار طبقوں کے اس طرزِ عمل سے قدرے مایوس ہو کر سرمایہ دار سے اپنا حق مانگتا ہے تو حکومت کی پوری قوت اس کی پشت پناہ بن کر خستہ حال انسان کو کچل دیتی ہے۔ وہ جب اپنی جان اور اپنے مال اور اپنی عزت و آبرو کو غیر محفوظ پا کر قانون کے محافظوں کی طرف رجوع کرتا ہے تو وہاں اُس کی کوئی شنوائی نہیں ہوتی۔ اس کی التجائیں، اس کی آہیں اور نالے امن اور انصاف کے پاسبانوں کے احساس کو بیدار نہیں کرتے۔ ان غریبوں کی عزت و آبرو سرِبازار لُٹتی ہے مگر کوئی ان کی دادرسی نہیں کرتا۔ ان کے لختِ جگر اُن سے زبردستی چھین لیے جاتے ہیں مگر کوئی ان کی معاونت اور دستگیری پر آمادہ نہیں ہوتا۔ اور اب تو حالت یہ ہو گئی ہے کہ کوئی ستم زدہ اگر دادرسی کے لیے فریاد بھی کرتا ہے تو اس کی جان پر آبنتی ہے، بلکہ اکثر و بیشتر حالات میں اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ آپ کسی اخبار کو اٹھا کر دیکھیں تو آپ کو ایک صفحے پر ہی اس قسم کے بے شمار روح فرسا واقعات ملیں گے۔ کسی غریب کے بیٹے کو ظالموں نے قتل کیا، یا کسی کمزور کی بچی کو سماج دشمن عناصر نے نشانۂ ستم بنایا اور اس نے قانون کے محافظوں کو امداد اور انصاف کے لیے پکارا تو وہ خود اور اس کے ہمدرد ان عناصر کے ظلم کا تختۂ مشق بنے۔

یہ صورتِ حال اتنی اندوہناک ہے کہ اس کے تدارک کی فکر کرنی چاہیے۔ برسرِ اقتدار حضرات کو یہ بات نہ بھولنی چاہیے کہ جن لوگوں کو آج اپنے مخصوص مفادات کی خاطر کھلی چھوٹ دی جا رہی ہے، وہ اتنے دلیر ہو جائیں گے

کہ آخر کار خود وہ بھی ان کے شر سے محفوظ نہ رہ سکیں گے۔ جس فرد یا گروہ کو لوگوں کے گریبان چاک کرنے کی عادت پڑ جائے اس کی نظر سے اپنے اور پرائے کا امتیاز اٹھ جاتا ہے اور وہ جلد ہی اپنے ہاتھ اُن لوگوں کی طرف بڑھانا شروع کر دیتا ہے جنہوں نے اسے اس کام پر اُبھارا تھا۔ اس کے ساتھ دوسری حقیقت یہ بھی ذہن نشین رہنی چاہیے کہ جس قوم پر مایوسی اور قنوطیت چھا جاتی ہے اُس کے اندر اُبھرنے اور ترقی کرنے کی ساری صلاحیتیں ختم ہو جاتی ہیں۔ وہ مملکت جس کے بیشتر افراد کو اپنی زندگی، اپنی عزت و آبرو اور اپنے انسانی حقوق کے بارے میں اطمینان نہ ہو اُسے آخر کس چیز سے دلچسپی ہو سکتی ہے۔ ایسی قوم اپنا سارا وقت اضطراب اور پریشانی میں گزارتی ہے اور اس طرح اس کی ساری قوتیں اضمحلال کا شکار ہو جاتی ہیں۔

جسٹس کارنیلیس نے دوسری بات جس کی طرف بار بار اشارہ کیا ہے وہ یہ ہے کہ پاکستان میں اسلامی شریعت سے کماحقہٗ فائدہ نہیں اٹھایا گیا۔

اسلام سے ہماری قوم نے جس طرح انحراف کیا ہے اور جس طرح اب بھی اسے پسِ پشت ڈال رہی ہے یہ واقعی ایک بڑی دلفگار داستان ہے۔ یہ خطۂ ارضی اسلام کے نام پر جان و مال اور عزت و آبرو کی بے حد و حساب قربانیاں دے کر حاصل کیا گیا تھا۔ لیکن ابھی تک ہم اسے اسلامی مملکت بنانے کے معاملے میں یکسو نہیں ہو سکے اور ہر وقت اس تاک میں لگے رہتے ہیں کہ کسی طرح اس سے ہمیں نجات حاصل ہو جائے۔ پاکستان چند افراد کو اونچے عہدے دلانے اور چند سرمایہ داروں کو دولت جمع کرنے کے بہتر مواقع بہم پہنچانے کے لیے تو حاصل نہیں کیا گیا تھا۔ یہ ملک اس برِ عظیم کے مسلمانوں کی دلی تمناؤں کا مرکز اور اُن کی ملی اور دینی آرزوؤں کا مظہر ہے۔ انہوں نے اپنے سارے دنیاوی مفادات کو نظر انداز کرتے ہوئے متحد ہو کر اس کے قیام کی اس لیے جدوجہد کی تھی کہ وہ اس خطۂ ارضی میں اللہ کا قانون اور اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو رائج دیکھنے کے متمنی تھے۔ اور وہ آج تک اسی آرزو میں جی رہے ہیں۔ اگر معاملہ صرف چند لوگوں کو عہدے دلوانے یا کاروباری مواقع بہم پہنچانے کا ہوتا تو عام مسلمان اس کے لیے اتنی عظیم قربانی دینے کے لیے ہرگز تیار نہ ہوتے۔ خصوصاً وہ مسلمان جنہیں ہندوستان ہی میں رہنا تھا وہ تو بہر حال کبھی بھی اس نقصان کے لیے آمادہ نہ ہو سکتے تھے۔ جان و مال کا یہ سارا زیاں محض اسلام کی

محبت میں خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کیا گیا اور دین کی سربلندی اور عملداری کے لیے کسی بڑے سے بڑے نقصان کی بھی قطعاً پرواہ نہ کی گئی۔ اب اِن لوگوں کے سامنے جب اسلام سے انحراف کے واقعات آتے ہیں تو ان کے دل پر جو گزرتی ہوگی اُس کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جنہوں نے کبھی مقدس آرزوؤں کے نام پر اس قسم کے دھوکے کھائے ہوں۔

پاکستان کا اسلام کے بغیر تصور ہی بالکل غلط ہے۔ یہ ملک نہ تو کوئی جغرافیائی وحدت ہے اور نہ لسانی اور نسلی وحدت۔ اس کے دونوں بازوؤں کے درمیان ہزار سے زیادہ میل کا فاصلہ حائل ہے۔ اور ان کے باشندوں کے مابین سوائے اسلام کے کوئی چیز بھی قدر مشترک کی حیثیت نہیں رکھتی۔ زبانیں الگ، لباس الگ، تہذیب و معاشرت الگ، نسلی خصوصیات ایک دوسرے سے بالکل الگ۔ اسلام کا رشتہ ہی وہ ایک رشتہ ہے جو دونوں بازوؤں کے عوام کو آپس میں جوڑتا ہے۔ پھر مغربی اور مشرقی پاکستان کے اختلاف کو نظر انداز کرتے ہوئے ہم جب مغربی پاکستان کے حالات کا جائزہ لیتے ہیں تو ہم یہاں بھی بڑے وسیع اختلافات پاتے ہیں۔ اس خطے میں بھی لاتعداد نسلیں آباد ہیں جن کے اپنے اپنے مزاج، اپنی مخصوص عادات اور اپنی الگ زبان ہے۔ پنجابی، پٹھان، سندھی، بلوچی کے درمیان سے اگر اسلام کا تعلق ختم ہو جائے تو کوئی دوسری سلک ایسی نہیں رہتی جو انہیں ایک دوسرے سے منسلک رکھ سکے۔ معاشی مفادات کا اشتراک کبھی اتحاد کی پائیدار بنیاد نہیں بن سکتا۔ اگر اسلام کو درمیان سے ہٹا دیا گیا تو پھر یہ شیرازہ بالکل منتشر ہو کر رہ جائے گا۔

اس سلسلے میں اس بات کو بھی ہمیشہ نگاہ میں رکھنا چاہیے کہ قوت و طاقت کے اُس اتھاہ خزانے کو، جس کی جڑیں ہماری ملت کے قلب و دماغ میں پیوست ہیں، نظر انداز کر کے اگر ہم کوئی دوسرا نظامِ زندگی اپناتے ہیں تو یہ درحقیقت اپنی موت کو دعوت دینا ہے۔ ہمیں زندہ رہنے کے لیے ایک اجتماعی نصب العین چاہیے۔ وطنی قومیت سے ہم یہ کام نہیں لے سکتے۔ اس کی دو وجوہ ہیں۔ ایک یہ کہ اب بین الاقوامی سطح پر اس اجتماعی تخیل کو بالکل زوال آچکا ہے۔ اب دنیا کی تعمیر نَو وطنی قومیت کی بنیاد پر نہیں بلکہ افکار و نظریات کی اساس پر ہو رہی ہے۔

اس بنا پر قومیت کے پٹے ہوئے اور فرسودہ نظریے کو اپنانا ہمارے لیے بالکل ناممکن ہے، خصوصاً جب کہ یہ نظریہ مسلم قوم کے اجتماعی تخیل سے بھی پوری طرح متصادم ہو۔ دوسرے کسی غیر اسلامی نظام کو پوری یکسوئی کے ساتھ اپنانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ پہلے مسلم قوم کے دل و دماغ سے اسلام کی محبت اور اس کے اثرات کو یکسر ختم کیا جائے۔ انسان کسی نئے نظام کو اُسی صورت میں اپناتا اور اسے دنیا میں سربلند کرنے کے لیے تگ و دو کرتا ہے جب وہ پہلے نظام کو نہ صرف ترک کر دیتا ہے بلکہ اس کا مخالف ہو جاتا ہے۔ نفی کے بغیر اثبات ممکن ہی نہیں۔ مسلم قوم کو اسلام سے بیگانہ تو کیا جا سکتا ہے، اُس کے ذہن میں اس کے بارے میں مختلف قسم کے شکوک و شبہات بھی پیدا کیے جا سکتے ہیں، لیکن اُسے اس نعمتِ عظمیٰ کا مخالف بنا دینا کسی طرح ممکن نہیں ہے۔ یہ قوم ابھی تک عقل و فکر سے اتنی عاری نہیں ہوئی کہ جس نظام کے سہارے اُسے دنیا میں عزت و سربلندی ملی، جس کی قوت نے اُسے آج تک زندہ رکھا، وہ اُسے ہی مٹا دینے پر تُل جائے۔ گزشتہ دو صدیوں سے، اور خاص طور پر پچھلے پچاس سالوں میں اس مقصد کے لیے کتنی ہی کوششیں کی گئیں، اور ان کوششوں میں خود مسلم قوم کے کتنے ہی نامی گرامی رہنما بھی شریک رہے، مگر یہ بالکل بارآور نہ ہو سکیں۔ اس معاملے میں اتاترک جیسے مردِ آہنی کو شدید ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ پھر ہمارے اس عہد میں جمال عبدالناصر نے بھی اسی قسم کا تجربہ کیا اور اس کا حسرتناک انجام ہمارے سامنے ہے۔ آمریت کے پورے اختیارات رکھنے کے باوجود اور اسلام کے خادموں کو ناقابلِ بیان مظالم کا تختۂ مشق بنانے کے باوجود، نہ عربوں کو مغربی تہذیب کا صحیح معنوں میں علمبردار بنایا جا سکا اور نہ ترکوں کو۔ البتہ اس کشمکش میں قوم کی بے اندازہ طاقتوں اور صلاحیتوں کو ضائع کیا گیا۔ جتنی قوت اسلام کو مٹانے اور قوم کو کسی غیر اسلامی نظامِ زندگی کا گرویدہ بنانے میں صرف کی گئی اس سے آدھی قوت بھی اگر مسلمانوں کو صحیح معنوں میں مومن و مسلم بنانے میں صرف کی جاتی تو آج ہمیں وہ ذلت و رسوائی نہ دیکھنی پڑتی جو بدقسمتی سے ہم دیکھ رہے ہیں۔ اس آویزش سے اسلام کے کسی دشمن کا تو کوئی نقصان نہیں ہوا، اُسے تو فائدہ ہی ہوا ہے، البتہ امتِ مسلمہ کی کمر ٹوٹ گئی ہے۔

مسلم قوم کے مغرب زدہ سربراہوں کو اس بات پر بھی غور کرنا چاہیے کہ اسلام کو چھوڑ کر آخر وہ کس تہذیب کو اپنانے کا ارادہ رکھتے ہیں؟ مغربی قوموں نے اگر مسیحیت کو خیرباد کہا تو یونان اور رُوم کی مادی تہذیب اُن کے

پاس موجود تھی جسے انہوں نے فوراً زندہ کر کے اُسے اپنی اجتماعی زندگی کی اساس بنا لیا۔ مسلمانوں کے پاس اسلام کے علاوہ وہ کونسا تہذیبی سرمایہ ہے جس کے بل بوتے پر وہ زندہ رہ سکتے اور ترقی کر سکتے ہیں؟ کیا عقل یہ باور کر سکتی ہے کہ مسلمان اسلام جیسی جامع اور حیات آفرین تہذیب کو چھوڑ کر مغرب کی مادی تہذیب کو اپنا لیں گے؟ خصوصاً ان حالات میں جبکہ اس کی ساری برائیاں بھی اُبھر کر سامنے آچکی ہیں، اسلام کو تیاگ دینے سے جو خلا ہوگا اُسے آخر کس تمدن سے پُر کیا جائے گا؟ اور اُسے پُر کرنے میں کتنی دیر لگے گی؟ اور اُس کے لیے کتنی جدوجہد کرنی پڑے گی؟ ان سب باتوں پر ٹھنڈے دل سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔

جسٹس کارنیلیس نے اپنے متعلق بھی ایک ایسی بات ارشاد فرمائی جو ہمارے ملک کے حکمرانوں اور اصحابِ اقتدار کے لیے ایک بیش قیمت نصیحت ہے۔ انہوں نے کہا "مَیں اگرچہ مذہباً عیسائی ہوں مگر چونکہ مَیں نے جس دستور اور آئین کی وفاداری کا حلف اٹھایا ہے اُس کی بنیاد اسلام ہے، اس لیے مَیں نے اسلام کے مطابق ہی سارے فیصلے کرنے کی کوشش کی ہے اور مَیں کہہ سکتا ہوں کہ مَیں آئینی مسلمان ہوں۔" اُن کے اس دعوے کی تصدیق مختلف مواقع پر ہوتی رہی ہے۔ خصوصاً سڈنی (آسٹریلیا) میں قانون دانوں کے ایک بین الاقوامی اجتماع کے موقع پر انہوں نے اسلامی تعزیرات کے حق میں جس جرأت کے ساتھ دلائل پیش کیے وہ ہر لحاظ سے قابلِ ستائش تھی۔ اُن کے رفقاء کار نے ان کی الوداعی تقریبات میں اس امر کی تصدیق کی ہے کہ جسٹس موصوف نے اسلامی نظامِ حیات، خصوصاً اسلامی تصورِ انصاف اور اس کے تقاضوں اور عدلیہ کے کردار کو ہمیشہ سمجھنے کی کوشش کی اور اس سلسلے میں قرآن مجید کے علاوہ احادیث اور فقہ کی کتابوں کا بھی برابر مطالعہ کرتے رہے۔

ہم دیانتداری سے یہ محسوس کرتے ہیں کہ سارے اسلامی ممالک میں اور خود ہمارے ہاں بھی خرابی کی اصل جڑ یہ ہے کہ ہمارے برسرِ اقتدار طبقے جس دستور کی وفاداری کا حلف اٹھا کر اقتدار کے تخت پر متمکن ہوتے ہیں اُس کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتے۔ آپ پوری دنیائے اسلام اور پاکستان کے حالات کا جائزہ لیں تو آپ کو ہر جگہ انتشار کے بھیانک مناظر نظر آئیں گے اور اگر ان مناظر کے پسِ پردہ جھانک کر دیکھیں تو آپ کو یہی معلوم ہوگا کہ قوم جس راہ پر چلنا چاہتی ہے اور جس راہ پر چلنے کا اپنے سربراہوں سے تقاضا کرتی ہے، وہ تمام زبانی

وعدوں کے باوجود اس راہ پہ گامزن ہونے کے بجائے دوسری راہوں پر چل نکلنے کی کوشش کرتے ہیں اور قوم کو قوت کے بل بوتے پر اُس کی خواہش کے علی الرغم اُن راہوں پہ دھکیلتے ہیں جو اُسے کسی طرح بھی اُس کی منزلِ مقصود کی طرف لے جانے والی نہیں۔

اگر کسی فرد یا گروہ کو وہ اجتماعی تخیلات پسند نہیں جن کے مطابق قوم اپنے نظامِ حیات کی تشکیل کرنا چاہتی ہے تو اس کے لیے سیدھی راہ یہ ہے کہ پہلے وہ اپنے تخیلات کو صاف صاف قوم کے سامنے پیش کر کے رائے عامہ کو اپنے حق میں ہموار کرے اور جب اکثریت اس کی ہم خیال ہو جائے تب وہ مسندِ اقتدار سنبھال کر اپنے عزائم کی تکمیل کرے۔ لیکن یہ بات عقل و دانش اور حق اور انصاف کے یکسر منافی ہے کہ کوئی فرد یا گروہ قوم کے سامنے تو اس بات کا حلف اٹھا کر اقتدار کے تخت پر متمکن ہو کہ وہ ملت کے سارے معاملات کو اسلام کے مطابق چلائے گا اور اُس کے مسائل کو اسلام کے دیئے ہوئے ضابطوں کے مطابق حل کرے گا اور اسلامی احکام کو انفرادی اور اجتماعی زندگی کی اساس اور بنیاد بنائے گا، مگر جب زمامِ کار اس کے ہاتھ میں آجائے تو قوم کے منشا اور مرضی کے بالکل خلاف غیر اسلامی تہذیب و ثقافت اور خلافِ اسلام احکام و قوانین اور اصول و نظریات کو بالجبر اُس پر مسلط کرنا شروع کر دے۔ یہ طرزِ عمل امانت اور دیانت کے یکسر منافی ہے۔

جب قوم کسی کو زمامِ کار سونپتی ہے تو اس کے ساتھ مملکت کے خزانے اور اس کی فوج اور پولیس اور انتظامی مشینری کی طاقت بھی اُس کے حوالے کرتی ہے تاکہ وہ قوت و طاقت کے ان متعدد وسائل سے کام لے کر قومی آرزوؤں اور تمناؤں کو پُورا کرے۔ اس مقصد کے لیے وہ ہر قسم کے ایثار سے کام لیتی ہے۔ بے تحاشا ٹیکسوں کے بار اپنے سر لیتی ہے، اور اپنی گردن میں اقتدار کی اطاعت کا قلادہ ڈالتی ہے۔ کسی فرد اور گروہ کے خلوص اور امانت کا اندازہ اسی ایک بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ جس مقدس وعدے کے ساتھ اُسے یہ سارے وسائل اور اختیارات تفویض کیے گئے ہیں اُس نے اُسے پُورا کرنے کی کہاں تک کوشش کی ہے۔ اگر اُس نے ایسا نہیں کیا تو یہ صریح بددیانتی اور خیانت ہے۔

مسلمان ممالک میں آج کل دستور کے حلف کا جو حشر ہو رہا ہے وہ ناقابلِ بیان ہے۔ جن حضرات کو قوم مختلف امانتیں سونپتی ہے وہ ان کا بالکل احترام نہیں کرتے۔ قوم ایک شخص کے ہاتھ میں فوج کی زمام کار دیتی ہے کہ وہ اسے دشمنوں سے بچائے مگر وہی شخص حلف کے سارے تقاضوں کو پسِ پشت ڈال کر اس قوت کو اقتدار کے حصول کے لیے استعمال کرنے لگتا ہے اور جب اس مقصد میں کامیاب ہو جاتا ہے تو اس راہ پر قوم کو بڑھانے کی کوشش کرتا ہے جو اسے کسی صورت بھی پسند نہیں ہوتی۔ اسی طرح قوم ایک شخص کو پولیس کا انتظام سپرد کرتی ہے تاکہ وہ امنِ عامہ کی حفاظت کرے مگر وہ شخص اپنے اصل فرائض سے جس کا وعدہ اس نے حلف میں کیا تھا، غافل ہو کر ایک خاص طبقے کے مفادات کی حفاظت شروع کر دیتا ہے اور کسی مخصوص گروہ کا تسلّط قائم رکھنے اور اس سے اتفاق نہ کرنے والوں کو پریشان اور ہراساں کرنے میں ساری قوت صرف کر دیتا ہے۔ یہ درحقیقت خدا اور خلق دونوں سے بدعہدی بھی ہے اور خیانت بھی۔ کیونکہ جن وسائل و اختیارات کو وہ استعمال کر رہا ہے وہ اس کی آبائی جائداد نہیں ہیں بلکہ ایک صریح معاہدے کے تحت، چند قطعی شرائط کے ساتھ اس کے سپرد کیے گئے ہیں جن کی پابندی کا اس نے صاف الفاظ میں حلف اٹھایا ہے۔ کسی شخص کے ضمیر میں رتی برابر بھی اخلاقی حس موجود ہو تو یا وہ اس کا حلف نہ اٹھائے گا، یا پھر اس کی خلاف ورزی نہ کرے گا۔

جب کوئی فرد یا گروہ عوام کی خواہشات کے علی الرغم اقتدار پر متمکن ہو جاتا ہے اور ان کی آرزوؤں کا خون کر کے نظامِ مملکت چلاتا ہے تو لامحالہ وہ اپنے گرد حق گو اور مخلص اور حقیقی خیر خواہ لوگوں کو کبھی جمع نہیں کر سکتا۔ وہ اپنے ہاں انہی لوگوں کو شرف باریابی دیگا جو ایمان بکنے اور ضمیر بیچنے میں بے باک ہوں، جو ہر معاملے میں اُس کی ہاں میں ہاں ملائیں، اس کے کارناموں کو بڑھا چڑھا کر پیش کریں، اُس کے معائب کو محاسن ثابت کریں اور اُسے ہر لحظہ یہ باور کراتے رہیں کہ حضورؐ کا اقبال ترقی کر رہا ہے۔ آدمی جو کچھ کرتا ہے اُس کے لیے اطمینان چاہتا ہے۔ اگر اُسے ضمیر کی بے چینی لاحق ہو اور دلی اطمینان میسّر نہ ہو تو وہ باہر سے خوش کن آوازیں سن کر تسلی حاصل کرتا ہے۔ تاریخ میں دیکھیے کہ اگلے وقتوں میں کوئی حکمران جتنا زیادہ بگڑا ہوا ہوتا تھا اسی تناسب سے وہ اپنے دربار میں قصیدہ خوانوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد جمع کرتا تھا۔ جب انسان کا ضمیر اُسے اندر سے لعنت

ملامت کر رہا ہو تو وہ قدرتی طور پر باہر سے اپنی مدح و ستائش سننے کا آرزومند ہوتا ہے۔ آج اگرچہ وہ پرانے نواب اور بادشاہ اور پیشہ ور قصیدہ گو تو نہیں رہے۔ مگر ان کی روح اسی طرح موجود ہے۔ آج بھی کوئی حکمران جتنا حق و انصاف کے تقاضوں کو پس پشت ڈالتا ہے، اور قومی آرزوؤں اور امنگوں کی تکمیل کے بجائے انہیں کچلتا ہے اتنا ہی وہ اپنے آپ کو ایسے لوگوں کی معاونت اور دستگیری کا محتاج پاتا ہے جو اس کی ہر صحیح اور غلط بات پر تعریف و توصیف کے ڈونگرے برساتے رہیں۔ اس کی ہمیشہ یہی خواہش ہوتی ہے کہ اس کے کان میں کوئی ناگوار آواز نہ پڑنے پائے اور جو آواز بھی آئے وہ مدح و ستائش سے لبریز ہو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حکومت کے ایوانوں میں باضمیر اور ملت کے حقیقی دردمندوں کے بجائے ایسے لوگوں کی پذیرائی ہونے لگتی ہے جنہیں اپنے مفادات دنیا کی ہر چیز سے عزیز تر ہوں۔ ان حالات میں فوج اور پولیس ایک گروہ کے اقتدار کی حفاظت کے لیے وقف ہو جاتی ہے، عدلیہ کو مفلوج کیا جاتا ہے، مقننہ کو انتظامیہ کا تابع فرمان بنایا جاتا ہے۔ انتظامیہ اپنے اصل فرائض انجام دینے کے بجائے برسراقتدار طبقوں کو خوش کرنے میں منہمک رہتی ہے، اور جو لوگ حکومت کا ساتھ دینے والے ہوں انہیں نہ صرف ہر قسم کی سہولتیں اور آسانیاں میسر آتی ہیں بلکہ انہیں اس بات کی بھی کھلی چھٹی ہوتی ہے کہ وہ عوام پر جس طرح چاہیں دستِ ظلم دراز کریں۔ یہ لوگ ہر قسم کے مواخذہ سے محفوظ ہوتے ہیں۔

حال ہی میں صدر ناصر کے دستِ راست مارشل عبدالحکیم عامر نے دنیائے عرب کی تباہی پر ایک وصیت کی صورت میں جو تبصرہ کیا ہے وہ درحقیقت پوری دنیائے اسلام پر تبصرہ ہے۔ اس نے صاف کہا ہے کہ "فوج کو حکومت کے تحفظ کا ضامن ہونا چاہیے مگر اسے حکومت کو عوام پر مسلط کرنے کا ذریعہ نہ بننا چاہیے"۔ پھر مارشل نے اس بات کی بھی صراحت کی ہے کہ آزادی انسان کا پیدائشی حق ہے اور کسی فرد یا ادارے کو یہ حق سلب کرنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ یہ حق کوئی خیرات نہیں ہے جسے دستِ سوال دراز کر کے حاصل کیا جائے۔ یہ فطری حق ہے اور جو گروہ عوام کو اس سے محروم کرتا ہے وہ انصاف کا خون کرتا ہے۔ اس سلسلے میں اس کے اپنے الفاظ قابلِ غور ہیں:

"میں کبھی یہ تصور نہ کر سکتا تھا کہ مصر میں آزادی اظہار رائے کو کچلنے کا عمل مجھے بھی اپنی لپیٹ میں لے لے گا۔ میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ آزادی کو ٹکڑوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا اور

اگر اسے محدود کر دیا جائے تو کوئی شخص بھی اس کی حدود سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔ مجھے امید ہے کہ ہم جس عذاب سے دوچار ہیں اس سے وطن عزیز مصر اور دوسرے عرب ملکوں میں سبق حاصل کیا جائے گا۔"

مارشل نے اس ضمن میں ایک عرب دانشور وزیر سے اپنی ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

"ایک عرب وزیر نے ایک بار مجھ سے کہا: کیا آپ کو یاد ہے کہ ۱۹۵۲ء سے پہلے اہل مصر حق کے لیے جدوجہد کیا کرتے تھے؟ پھر اب کیا ہو گیا ہے؟ اب کسی سیاسی، اقتصادی، فوجی یا سماجی واقعہ پر کوئی حقیقت پسندانہ تبصرہ نہیں ہوتا۔ کیا آپ تنقید سے اتنے خائف ہیں کہ اخبارات پر بادشاہت اور جاگیرداری کے سیاہ ترین ایام کی سی خاموشیاں مسلط کر دی گئی ہیں"؟

۱۹۶۵ء میں جب میں فرانس گیا تو میں نے دیکھا کہ فرانسیسی صدر ڈیگال کی بین الاقوامی عظمت اور وقار کا سرچشمہ کیا ہے۔ انہیں یہ عظمت قومی اسمبلی میں اپوزیشن، مختلف پارٹیوں اور آزاد پریس کی تنقید سے حاصل ہوئی ہے۔ یہ بات بڑی افسوسناک ہے کہ مصر میں آج مملوک کا زمانہ اور محلات اور درباروں کا دور عود کر آیا ہے۔ موقع پرستی اور خود غرضی کا دور دورہ ہے۔ میں نے صدر ناصر کی توجہ ان باتوں کی طرف مبذول کرائی۔ لیکن مجھ پر یہ ظاہر ہوا کہ وہ خود اس حالت کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔

ایک روز میں نے صدر سے پوچھا کہ کیا انہیں علم ہے کہ فلاں فلاں نے اپنے رشتہ داروں کو امپورٹ لائسنس دیئے ہیں اور ان کے ساتھ اپنا حصہ رکھا ہے؟ اس پر صدر نے جواب دیا۔ ہاں بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ۔ جب میں نے صدر سے کہا کہ اب اس رشوت و بدعنوانی کو ختم کرنے کا وقت ہے تو صدر نے کہا: فکر مت کرو عبدالحکیم۔ ان کا مستقبل میرے ہاتھ میں ہے اور وہ خوف یا لالچ کے تحت میری غیر محدود حمایت کے ضامن ہیں"۔

تھوڑی دیر کے لیے اس سوال کو نظر انداز کر دیجیے کہ یہ وصیت جو مارشل موصوف کی طرف منسوب کی گئی ہے حقیقی ہے یا وضعی، بلکہ صرف یہ دیکھیے کہ کیا تقریر و تحریر پر پابندیاں عائد کرنے سے عوام کے جذبات غلط راستوں پر بہہ نہیں نکلتے اور کیا قوت کے بل بوتے پر لوگوں کی گردنوں پر مسلط ہونے سے کوئی بھلائی کا کام کیا جا سکتا

ہے ؛ غیر محدود اقتدار صرف مدح و ستائش چاہتا ہے اور جو لوگ اپنے ضمیر اور ایمان کو فروخت کر کے یہ دھندا کرتے ہیں وہ اس کے بدلے مختلف قسم کی جائز و ناجائز مراعات کے طالب ہوتے ہیں۔ یہ لوگ اقتدار کے زیرِ سایہ مختلف قسم کی بدعنوانیاں کرتے ہیں اور کوئی ان کا ہاتھ روکنے والا نہیں ہوتا اور اس طرح پورا معاشرہ ایک عذاب میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

مصر میں تو خیر جو کچھ ہوا ہے سو ہوا ہے، پاکستان میں بھی صورتِ حال کسی لحاظ سے بھی تسلی بخش نہیں۔ ایک دو روزناموں کو چھوڑ کر ملک کے باقی اخبارات بالواسطہ یا بلاواسطہ پریس ٹرسٹ کے قبضے میں ہیں، اور جو اس کے قبضے میں نہیں ہیں ان کا گلا بھی جابرانہ قوانین اور اشتہارات بانٹنے کی پالیسی نے گھونٹ رکھا ہے۔ ان اخبارات کا کام اب یہی رہ گیا ہے کہ وہ حقیقی حالات کو چھپائیں، حکمراں طبقے کی مدح سرائی کریں، اُس کے دلپسند افکار و نظریات کی اشاعت کریں اور اُس تہذیب و تمدن کو فروغ دینے کا ذریعہ بنیں جنہیں برسرِ اقتدار طبقہ یہاں رواج دینا چاہتا ہے۔ جو اخبارات حکومت کے تسلط سے کسی حد تک آزاد ہیں اُن پر کئی قسم کی ناروا پابندیاں عائد کی گئی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ کھل کر اظہارِ خیال نہیں کر سکتے۔ پھر جگہ جگہ دفعہ ۱۴۴ کے نفاذ کی وجہ سے قوم اپنے خیالات کا اظہار تقریر کی صورت میں بھی نہیں کر سکتی۔ جس قوم کو نہ تو تحریر کی آزادی ہو اور نہ تقریر اور اجتماع کی وہ آخر اپنے دلی احساسات اور جذبات کو کیسے ظاہر کر سکتی ہے ؟ اور حکمرانوں کو قوم کے خزانے سے تنخواہ لے کر، قوم ہی کے دیئے ہوئے وسائل و اختیارات استعمال کر کے خود قوم ہی کی زبان بند کرنے کا آخر کیا حق ہے ؟

پھر دستور کے حلف کی یہاں جو مٹی پلید ہو رہی ہے وہ بھی کسی سے پوشیدہ نہیں۔ یہاں کے حکمرانوں نے حلف تو اس بات کا اٹھایا ہے کہ وہ قرآن و سنت کے پابند رہیں گے اور اسلام کی رہنمائی میں امورِ مملکت چلائیں گے مگر عملاً قریب قریب اس کے برعکس کام ہو رہا ہے۔ قوم کو اسلام کی راہ پر آگے بڑھانے کے بجائے اس پر مغربی تہذیب مسلط کی جا رہی ہے۔ اور حکومت ہر اس تحریک کی تائید پر کمربستہ نظر آتی ہے جس میں اسلام سے انحراف کی ذرہ برابر بھی گنجائش ہو۔ اس سلسلے میں یوں تو متعدد مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں مگر ہم یہاں صرف ایک مثال

پیش کرتا ہوں۔

مسجد کو اسلامی معاشرے میں جو مقام حاصل ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ یہ وہ آخری حصار ہے جس میں اللہ کا دین پناہ لیتا ہے۔ چنانچہ جب ہم تاریخ اسلامی کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب بھی کسی بگڑے ہوئے بادشاہ یا فرماں روا نے دین کے علمبرداروں پر عرصۂ حیات تنگ کیا تو انہوں نے مساجد میں بیٹھ کر اللہ اور اس کے رسولؐ کے پیغام کو زندہ رکھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلامی تعلیمات کا جو حصہ ہم تک پہنچا ہے وہ ان مساجد اور ان کے بوریہ نشین ائمہ اور خطباء کا رہینِ مِنّت ہے۔ مگر دستور پر حلف اٹھانے کے باوجود آج محکمہ اوقاف کے ہاتھوں ان مساجد کا جو حشر ہو رہا ہے وہ بڑا عبرتناک ہے۔

فقہ اسلامی میں وقف کے بارے میں جو تعلیمات ملتی ہیں اُن کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک عبادت ہے جس کا مقصد اُخروی ثواب ہے۔ صاحبِ ہدایہ نے اسے بمنزلہ زکوٰۃ و صدقات قرار دیا ہے۔ اس بنا پر اوقاف کی مقدس املاک کو کسی غیر اسلامی کام میں لگانا نہ صرف ناجائز بلکہ صریح حرام ہے۔ وقف سے حاصل کردہ آمدنی دین کے اُسی کام پر صرف کی جانی چاہیے جس کی واقف نے تصریح کی ہے۔ ہاں اگر وہ آمدنی بچ جائے یا واقف کی شرائط وقف میں کوئی چیز شرعاً صحیح نہ ہو تو ایک وقف کو اُسی نوعیت کے کام پر کسی دوسرے وقف میں، یا شرعاً صحیح مصرف میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً وقفِ مسجد سے جو آمدنی حاصل ہو اُسے اِنہیں مصارف میں صرف کرنا جائز ہے جس کو مسجد کی آبادی میں دخل ہے۔ البتہ اگر واقف اس امر کی تصریح کر دے کہ مسجد کے مصالح پورے کر کے جو آمدنی بچ جائے اُسے فقراء اور غرباء پر صرف کیا جا سکتا ہے تو پھر یہ جائز ہے۔ لیکن اگر واقف یہ تصریح نہ کرے تو پھر کسی صورت میں یہ آمدنی کسی اور کام پر صرف نہیں کی جا سکتی۔ فقہاء نے اس امر کی بھی صراحت کی ہے کہ اگر وقف سے حاصل کردہ آمدنی مصالح مسجد سے بچ جائے اور اس کے جمع رکھنے میں احتمال ضیاع ہو تو اس صورت میں اس فاضل آمدنی کو دوسری مسجد کے مصالح پر صرف کرنا چاہیے جو مسجد موقوف علیہ سے قریب ہو اور اگر اُس مسجد میں ضرورت نہ ہو تو اس کے بعد کی قریب ترین مسجد میں اُسے صرف کیا جا سکتا ہے (الدرالمختار و ہدایہ)۔ مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ نے اِنہی احکام کی روشنی میں اپنی فاضلانہ تصنیف امداد الفتاویٰ میں یہ بات پوری وضاحت کے ساتھ فرمائی ہے کہ اگر واقف نے مصالح مسجد کے علاوہ

کسی اور مد پر خرچ کرنے کا ذکر نہ کیا ہو تو اس وقف کی آمدنی سے مجروحین، یتامیٰ اور اہلِ مقتولین کی امداد بھی نہیں کی جا سکتی۔

اب دیکھیے کہ محکمہ اوقاف مساجد اور دوسری وقف شدہ املاک کو کہاں تک احکام شریعت کے مطابق صرف کر رہا ہے۔ دلوں کے بھید تو خدا جانتا ہے لیکن یہ عجیب و غریب سانحہ ہے کہ اوقاف جیسی مقدس امانت ایک ایسے شخص کے سپرد کی گئی ہے جو اسلام کی نئی نئی تاویلات کے لیے مشہور ہے۔ یہ وہ صاحب ہیں جنھوں نے اردو میں نماز کی تحریک شروع کی۔ ان کے نزدیک اشتراکیت عین اسلام کے معاشی نظام کی ترجمانی کرتی ہے۔ چنانچہ ابھی حال ہی میں جشنِ نزولِ قرآن کے موقع پر انہوں نے اسلام کے معاشی نظام پر جو مقالہ پڑھا تھا اُس سے اس بات کی تصدیق کی جا سکتی ہے۔ اس شخص کو علماء سے فطری کد ہے اور وہ موقع بے موقع ان پر زبان طعن دراز کرتا رہتا ہے۔ اس کی نظر میں سائنسی تعلیمات اصل دین ہیں اور علماء کو انہیں حاصل کرنے کی پوری پوری کوشش کرنی چاہیے۔ یہ صاحب قرآن، حدیث، فقہ، تصوف اور کلام، الغرض دین کے ہر پہلو کے بارے میں ایسے نظریات رکھتے ہیں جنہیں عامۃ المسلمین کسی صورت میں بھی پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھتے۔ یہ کتنی ستم ظریفی ہے کہ ایسے شخص کو ایک ایسے محکمے کا ناظم بنا دیا گیا ہے جو اس ملک میں دین کی اساس ہے اور تعلیمات الٰہی کی حفاظت کا ایک بڑا ذریعہ ہے۔ حکومت کے نزدیک مغربی نظامِ تعلیم کے سوا کوئی دوسرا نظام تعلیم نہیں۔ لے دے کر مسجدوں میں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام سکھانے کا بندوبست تھا سو انہیں اب دوسری سرگرمیوں کا مرکز بنایا جا رہا ہے۔ علمائے کرام کو قرآن و حدیث پڑھانے کے بجائے مرغیاں پالنے کی تلقین کی جاتی ہے۔ یہ صاحب اتنا نہیں سوچتے کہ اگر ان علماء کا دینی تعلیمات میں انہماک ختم ہو گیا تو وہ دین کی کیا خدمت کر سکیں گے اور جو نوجوان ان سے تعلیم حاصل کر کے باہر نکلیں گے اُن کا معیار کیا ہو گا۔ دین کا علم نہایت وسیع علم ہے جسے اگر پورے انہماک اور یکسوئی سے حاصل نہ کیا جائے تو اس میں دسترس پیدا نہیں ہو سکتی۔

پھر اس محکمہ کی فیاضیوں اور غلط بخشیوں کی جو تفاصیل وقتاً فوقتاً اخبارات میں شائع ہوتی رہتی ہیں اُن سے

تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس محکمہ کے ناظم اوقاف کی رقوم خرچ کرتے وقت مساجد کے مخصوص مصالح سامنے رکھنے کے بجائے اسلام کے عمومی فائدے کو بھی سامنے نہیں رکھتے بلکہ بعض معاملات میں تو انہوں نے یہ امانت ایسی سرگرمیوں کی پشت پناہی کے لیے صرف کی ہے جو اسلام کی عین ضد ہیں۔ ابھی حال ہی میں اخبارات میں یہ روح فرسا خبر شائع ہوئی ہے کہ محکمہ اوقاف کی طرف سے اپوا کو ایک خطیر رقم ادا کی گئی۔ اور ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی کے رسالہ "فکر و نظر" کے شمارے اور مشینی ذبیحہ پر اس کے کتابچے کی کئی ہزار کاپیاں مساجد میں تقسیم کرنے کے لیے خریدی گئیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ محکمۂ اوقاف اسلام کی خدمت کے لیے قائم ہی نہیں کیا گیا بلکہ غیر اسلامی رجحانات اور افکار کو تقویت پہنچانے کے لیے معرضِ وجود میں لایا گیا ہے۔ کیا اُن لوگوں کی روحیں تڑپ نہ اٹھتی ہونگی جنہوں نے مقدس دینی آرزوؤں اور پاکیزہ جذبات کے ساتھ دین کی خدمت کے لیے اپنی املاک وقف کیں اور اب یہ املاک دین کی بربادی کا ذریعہ بنائی جا رہی ہیں؟

ممکن ہے کہ ملک کے سارے علماء نے صورتِ حال کی سنگینی کو پوری طرح محسوس نہ کیا ہو لیکن انہیں اب حالات کا آنکھیں کھول کر مشاہدہ کرنا چاہیے۔ مساجد ہی وہ آخری قلعے تھے جن میں اسلام کی حفاظت ہو رہی تھی اور ان کا وجود وہ آخری سہارا تھا جس کے دم قدم سے دین کسی نہ کسی صورت میں قائم تھا۔ اب اگر ان مساجد کے ائمہ و خطباء اور مدارس دینیہ کے چلانے والوں نے تنخواہوں اور ترقیوں کے لالچ میں آکر حکومت کا آلۂ کار بننا گوارا کر لیا تو پھر اس ملک میں اسلام کا خدا ہی حافظ ہے۔ اب ائمہ مساجد کی چھان بین کا سلسلہ شروع ہونے والا ہے تاکہ "ناپسندیدہ" (یعنی حکومت کے نقطۂ نظر سے اتفاق نہ کرنے والے) لوگوں کو چھانٹ پھینکا جائے۔ اس سے حالات کے رُخ کو بآسانی سمجھا جا سکتا ہے۔ یورپ میں اوقاف کو اور معابد کو حکومت کی تحویل میں دینے کا جو انجام ہوا اُس پر انہیں ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہیے۔ انگلستان کی ایک محققانہ تصنیف میں اس کا ذکر موجود ہے۔ ذیل میں ہم اس کا ایک اقتباس پیش کرتے ہیں:

"سب کے سب پادری حکومت کے نمائندے بننے لگے۔ ان کے تقرّر کا عام طریق یہ تھا

(باقی ص ۶۵ پر)

(بقیہ اشارات)

کہ کسی پادری کو پہلے ویلز میں جگہ دی جاتی اور اگر وہ حسبِ منشا کام کرتا اور حکومت کی تائید کرتا تو پھر اُسے زیادہ بہتر اور معقول معاوضے والی آسامی پر مقرر کر دیا جاتا۔ پادریوں کا کام اسی قدر تھا کہ وہ پورا موسم سرما لندن میں گزاریں اور ایوانِ اُمراء میں حکومت کے حق میں رائے دیں۔"

(ترقی پذیر ممالک میں بدعنوانی صـ۱۳۲)

اس کتاب کے فاضل مصنفین نے اس ضمن میں یہ بھی بتایا ہے کہ پادری جب حکومت کا آلۂ کار بننے لگے تو اس سے اُن کے وقار اور مذہب کو کیا نقصان پہنچا۔ چونکہ ان لوگوں کا تقرر حکومت کے مصالح کے تحت کیا جاتا تھا اس لیے وہ عوام کی دینی فلاح کی طرف توجہ دینے کے بجائے ہمیشہ حکومت کی عنایات حاصل کرنے کے درپے رہتے۔ انہیں گرجاؤں کے اندر عبادت کے لیے آنے والے مذہبی آدمیوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں کا مذہب سے تعلق آہستہ آہستہ ختم ہونے لگا اور وہ بالآخر بے دینی کے شکار ہو کر رہ گئے۔